دوسرا دوزخ
از
عمیرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دوسرا دوزخ

میرے پیارے اللہ!

''آپ کے نام یہ میرا پہلا اور آخری خط ہے، بچپن میں ایک بار ایک کہانی پڑھی تھی......ایک یتیم بچے کی کہانی، جسے اپنی کوئی ضرورت پوری کرنے کے لیے کچھ رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اللہ کے نام ایک چٹھی لکھتا ہے، وہ چٹھی ڈاک خانے والے کھول لیتے ہیں اور پھر اس بچے پر ترس کھاتے ہوئے کچھ رقم اکٹھی کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بھیج دیتے ہیں۔

تب وہ کہانی پڑھتے ہوئے مجھے ترس سے زیادہ اس بچے پر رشک آیا تھا، جس پر دنیا نے ترس کھا لیا......

مگر میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی میں ایک وقت ایسا آئے گا، جب مجھے بھی اللہ کے نام ایسا ہی ایک خط لکھنا پڑے گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا اس خط کو کھول کر پڑھنے کے بعد بھی کبھی مجھ پر ترس نہیں کھائے گی......یا شاید لوگ کبھی اس خط کو پڑھ ہی نہیں پائیں گے......''

''نہیں کیا یہ کہوں کہ پڑھنا نہیں چاہیں گے۔''

''نہیں......کیا......کہوں کہ یہ خط ان تک پہنچ ہی نہیں پائے گا......''

کاغذ پر سیاہی سے لکھی ہوئی تحریر دیکھی جا سکتی ہے۔ پڑھی جا سکتی ہے......سوچ کی لہروں پر بھیجی جانے والی تحریر کتنے لوگ پڑھ سکتے ہیں......لکھنے والے اور اللہ کے سوا......؟ میری خواہش تھی، میں بھی اس بچے کی طرح ایک کاغذ پر یہ تحریر لکھتی اور پھر اسی طرح لفافے پر اللہ کے نام لکھ کر ڈاک کے سپرد کر دیتی، مگر میں ایسا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔

لکھنے کے لیے ہاتھ میں قلم اور کاغذ ہونا چاہیے، میں دونوں چیزیں تھامنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں اپنا ہاتھ بستر سے اٹھا نہیں سکتی۔ ہاتھ ہلانے کی کوشش کروں گی تو میرے جسم پر موجود زخموں سے خون رسنا شروع ہو جائے گا۔ قلم ہاتھ میں تھاموں گی تو ہتھیلی کا ماس قلم کے ساتھ چپک جائے گا۔ انگلیاں موڑوں گی تو میرے Knuckles (انگلیوں کے جوڑ) پر پڑنے والی دراڑیں ہاتھوں کے باقی ماندہ گوشت کو برہنہ کر دیں گی۔ آنکھیں مسلسل کھلی رکھنا بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ درد کم کرنے کی دوائیں، مجھے ہوش میں رہنے نہیں دے رہیں۔ درد مجھے ہوش کھونے نہیں دے رہا۔

میں بول کر کسی دوسرے کو بھی خط نہیں لکھوا سکتی، میں الفاظ اکٹھے کرنے کے قابل نہیں رہی میرا ذہن درد اور اذیت سے ماؤف ہو رہا ہے، میرے منہ سے کراہوں کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل پا رہا۔ اور تکلیف اتنی ہے کہ میں......میں کراہ بھی نہیں پا رہی۔ منہ کھولنے کی کوشش میں میرے چہرے کی جلی ہوئی جلد اور گوشت چٹخنے لگتا ہے۔ خون اور پیپ رسنے لگتی ہے۔ لفظ کراہ بن جاتا ہے۔

میو ہاسپٹل کے برن یونٹ میں ایک بستر پر میں اپنی زندگی کے آخری گھنٹے گزار رہی ہوں، میرا ستر فیصد جسم جل چکا ہے۔ پچھلے چوبیس گھنٹے سے میں زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہوں۔ کیونکہ ڈاکٹر نے مجھے لاعلاج قرار دے دیا ہے۔

''یہ اگلے ایک دو گھنٹوں میں مر جائیں گی۔'' میں نے اپنے بستر سے کچھ فاصلے پر ڈاکٹر کو کچھ دیر پہلے کہتے سنا تھا۔ وہ پتا نہیں کس سے مخاطب تھا۔

''امی سے......ابو سے......مہوش سے......سجاد سے......لئیق سے پتہ نہیں کس سے......؟''

مگر اس نے یہ کہا ضرور تھا، میں نے اپنے کانوں سے سنا تھا......کان......؟ پتہ نہیں انہیں کان کہنا اب ٹھیک ہوگا یا نہیں......جلنے کے بعد چیزوں کو کوئلہ کہتے ہیں یا راکھ......جلی ہوئی عورت کو کیا کہتے ہیں؟ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے میں جن سوالوں کے جواب تلاش کر رہی ہوں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

میری ناک میں لگی ہوئی آکسیجن کی نالی دنیا میں میری آخری سانسوں کو ممکن بنا رہی ہے۔ میرے دائیں ہاتھ کی آبلہ بنی ہوئی پشت میں پیوست ایک ڈرپ قطرہ قطرہ کر کے میرے اندر وہ نمی پہنچا رہی ہے جو میرے وجود کو اس ہولناک اذیت سے چھٹکارا پانے بھی نہیں دے رہی۔ میں گردن سے پیروں تک ایک سلاخ دار پنجرے میں ہوں جس کو سفید رنگ کی ایک چادر سے ڈھانپا گیا ہے۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے تاکہ کپڑا میرے جسم سے نہ چھوئے۔ میرے جسم پر موجود گوشت، چربی، کھال سب کچھ جل کر صرف خون آلودہ اور پیپ زدہ ایک ڈھیر رہ گیا ہے۔ اور ڈاکٹر اس ڈھیر کو مزید کسی تکلیف سے بچانے کے لیے اس پر کپڑا چھونے نہیں دے رہے۔

میں اپنا ہاتھ اٹھا کر چہرہ چھو نہیں سکتی۔ مگر میں پھر بھی جانتی ہوں وہاں اب کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میرے چہرے کے سارے نقوش مسخ ہو چکے ہوں گے......

''ہاں......ہاں مگر آنکھیں......آنکھیں اب بھی باقی ہیں۔ آنکھیں اب بھی دیکھ سکتی ہیں......اور......اور دکھا بھی سکتی ہیں......میں پچھلے چوبیس گھنٹوں سے خود پر نظریں ڈالنے والے ہر شخص کی آنکھ کی پتلی میں اپنی شبیہہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ہر شخص نظریں چرا جاتا ہے۔ مجھے اپنی شبیہہ نظر نہیں آتی......

چوبیس گھنٹے......

چوبیس گھنٹے......

چوبیس گھنٹے......

صرف چوبیس گھنٹے ہی تو گزرے ہیں، مجھے گوشت پوست کے ایک نارمل انسان سے جھلسے ہوئے اس بے شناخت ڈھیر میں تبدیل ہوئے۔ چوبیس گھنٹے پہلے میں اپنی انگلیوں کے پوروں سے اپنے چہرے کے ہر نقش کو محسوس کر سکتی تھی۔ ناک کی باریک اٹھی ہوئی نوک، ہونٹوں کی مخصوص ساخت، گالوں کی ملائم جلد بھنوؤں کے بال، دراز خمدار پلکیں، تھوڑی کا گڑھا، مسکرانے پر گالوں میں پڑنے والے ڈمپل، کانوں کی نرم لو اور

اس میں لٹکتی ہوئی بالیاں، کمر تک لمبے سیاہ گھنے اور ملائم بال جو بہت اچھی طرح باندھے جانے کے باوجود میرے ماتھے اور گالوں پر بکھرے رہتے تھے اور جنھیں میں ہر وقت کانوں کے پیچھے اڑستی رہتی......اور......دراز خمدار پلکوں والی سیاہ ہنستی ہوئی آنکھیں۔

اب وہاں کیا ہے؟ میں جانتی ہوں......میں نہیں جانتی۔

مجھے آپ کو تو یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ میں آپ کو یہ سب کچھ بتانے کے لیے تو خط نہیں لکھ رہی، میں تو آپ سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔

"کیا پوچھنا چاہ رہی تھی؟ کیا پوچھنا چاہ رہی تھی؟ کیا پوچھنا چاہ رہی تھی......؟ آہ......مجھے یاد نہیں آ رہا۔

درد ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے۔ نرس میری ناک میں لگی ہوئی نالی کو ٹھیک کر رہی ہے۔ اس نے آکسیجن کے پریشر میں کچھ تبدیلی کی ہے۔ میں محسوس کر سکتی ہوں۔ میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں رحم ہے، ترس ہے؟ خوف ہے؟ کیا ہے؟ میری آنکھیں ایک بار پھر بند ہو رہی ہیں۔

میرے بستر کے پاس کھڑے لوگ میری سانسیں گن رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے میں مر جاؤں......میں جانتی ہوں، وہ چاہتے ہیں میں اس اذیت سے چھٹکارا پا جاؤں، مجھے علم ہے......میری بھی یہی خواہش ہے، میں بھی یہی چاہتی ہوں......مگر......مگر......وہ سوال جو میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں......وہ یاد نہیں آ رہا......پتہ نہیں کیوں......کیوں یاد نہیں آ رہا......میں وہ سوال پوچھے بغیر......پوچھے بغیر مرنا بھی نہیں چاہتی۔ کیسے مر جاؤں؟ مگر سوال......مگر سوال

میں یاد کر رہی ہوں، مجھے یاد آ جائے گا۔ کوئی میرے بستر کے پاس رو رہا ہے۔ میں آنکھیں کھولے بغیر بھی آواز پہچان سکتی ہوں......آخری سانسیں لیتے ہوئے بھی ان سسکیوں کو شناخت کر سکتی ہوں......

وہ میری ماں ہے......پچھلے چوبیس گھنٹوں سے میں اسے اسی طرح اپنے سرہانے دیکھ رہی ہوں۔ جلے پیر کی بلی کی طرح وہ......میرے بستر کے گرد پھر رہی ہے......میرے دائیں جانب......پھر میرے بائیں جانب......دائیں جانب......بائیں جانب......وہ روتی ہے......چپ ہو جاتی ہے......ہاتھ میں پکڑے ہوئے پنج سورۃ سے آیات اور دعائیں پڑھتی ہے۔ مجھ پر پھونکتی ہے......مجھے دیکھتی ہے۔ پھر رونے لگتی ہے۔ وہ پھر کچھ پڑھتی ہے......پھر پھونکتی ہے......وہ مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ تسلی دینے کے لیے نا محبت جتانے کے لیے۔

وہ میرا ماتھا چھوئے گی تو میرے ماتھے کی جھلسی ہوئی جلد اپنی جگہ چھوڑنے لگے گی......میں اور کراہوں گی......وہ میرا گال چومے گی تو وہاں موجود آبلے پھوٹ پڑیں گے۔ میں چیخوں گی۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے گی اور میرے جھلسے ہوئے گوشت میں سے خون رسنے لگے گا۔ میں اذیت برداشت نہیں کر پاؤں گی......کبھی ماں کے لمس کو آپ نے اولاد کے لیے برچھی بنتے دیکھا ہے......؟ وہ روتی جاتی ہے۔ میرے بستر کے گرد چکر کاٹتی جاتی ہے۔

نو ماہ اس عورت نے اپنے جسم کے اندر مجھے تخلیق کیا ہے۔ کس کو......میری ہڈیاں، میرا گوشت، میری جلد، میرا خون......سب کچھ اسی کے وجود ہی کا ایک حصہ تھا۔

بیس سال پہلے اس نے ایک مکمل وجود کو جنم دیا تھا، ہنستے کھلکھلاتے، ایک مکمل وجود کو...... بیس سال بعد اس مکمل وجود کو جھلسے ہوئے پیپ زدہ گوشت کے ڈھیر میں تبدیل ہوتے دیکھ کر وہ کیا سوچ رہی ہوگی......؟ اسے قرار کیسے آ سکتا ہے......؟

''بالوں میں تیل لگایا کرو ممن! اس طرح لاپروائی مت برتا کرو......'' میں اب بھی اس کی آواز سن سکتی ہوں۔ مگر اب میرے سر پر جھلسی ہوئی جلد کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

اس کے ہاتھوں کا بنایا ہوا کوئی ابٹن اب میرے چہرے کی رنگت کو بدل سکتا ہے نہ اس کی ملائمت میں اضافہ کر سکتا ہے۔

''کتنے کھر درے ہو رہے ہیں تمہارے ہونٹ...... بالائی لگاؤ ان پر۔'' وہ اب شاید شناخت بھی نہیں کر سکتی کہ میرے ہونٹ کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور کہاں ختم ہو جاتے ہیں؟

اس کا خریدا ہوا کوئی لباس اب میرے جسم کو دوسروں سے ممتاز نہیں کر سکتا تھا۔ بیس سال اس نے جس شاہکار کو تخلیق کرتے اور حفاظت سے رکھتے ہوئے گزار دیے تھے اسے کچھ دوسرے لوگوں نے چند ہی گھنٹوں میں ناقابل شناخت کر دیا تھا......

وہ کس کس کا چہرہ نوچنا چاہتی ہوگی؟ کس کس کو بے شناخت کر دینا چاہتی ہوگی؟ برن یونٹ کے اس بستر پر کس کس کو دیکھنا چاہتی ہوگی؟ پتہ نہیں...... پتہ نہیں...... نو ماہ اس نے مجھے اس اپنے جسم میں رکھا اور بیس سال اس نے مجھے اپنے گھر میں رکھا اور مجھے اس حال میں دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح میرے بستر کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔

میں سوچ رہی ہوں اللہ! آپ مجھے اس حال میں دیکھ کر کیا محسوس کر رہے ہوں گے۔ تخلیق تو مجھے آپ نے ہی کیا ہے۔ کئی صدیاں تو مجھے آپ نے بھی اپنے پاس رکھا ہے۔ میری آنکھیں، ناک ہونٹ...... سب کچھ آپ نے ہی بنایا تھا۔ اب اس جھلسے ہوئے جسم کو دیکھ کر آپ کیا سوچ رہے ہوں گے، جس چیز کو آپ نے بنایا...... انسان نے اسے بگاڑ دیا، جلا دیا، مسخ کر دیا...... آپ مجھے دیکھتے ہوئے کس اذیت سے گزر رہے ہوں گے؟ میری ماں کی طرح کیا آپ بھی بہت سے لوگوں کو......

''کب......؟''

''کب......؟''

میں اب ڈاکٹر کی آواز اپنے قریب سن رہی ہوں۔ وہ ایک بار مجھے دیکھنے آیا ہے۔ میں اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے اس کے قریب کھڑے اپنے باپ کو دیکھ رہی ہوں۔ اس کے چہرے پر اب بھی وہی بے یقینی ہے جو پچھلے چوبیس گھنٹوں سے جیسے اس کے چہرے پر کندہ ہو گئی ہے۔ اسے یقیناً اب تک یقین نہیں آیا ہوگا کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی بیٹی کے ساتھ ہوا ہے......

اخبار میں چھپی ہوئی سرخی پڑھنے اور اسے اپنے سامنے مجسم حالت میں دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' پھر اگر آپ اس ''سرخی'' سے خونی رشتہ رکھتے ہوں تو......؟''

پچھلے چوبیس گھنٹوں میں، میں نے اس کے ہاتھوں میں انجکشنز کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا وہ انجکشنز لاتا ہے۔ نرس ان انجکشنز کو ڈرپ

میں منتقل کر دیتی ہے۔ اس کے جھریوں زدہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈاکٹر کے نسخے اب کچھ بھی واپس نہیں لا سکتے...... نہ میرا چہرہ...... نہ اس کے نقش...... نہ میرا بے داغ جسم...... نہ میری...... نہ میری زندگی...... ہاں ان ہاتھوں سے وہ اگر کچھ روپے زیادہ کما لیتا تو آج میرا وجود جلے ہوئے گوشت کے اس ڈھیر میں تبدیل نہ ہوا ہوتا۔ اس کے چہرے کی بے یقینی اب شکست خوردگی میں تبدیل ہوگئی ہے۔ کبھی نہ کبھی انسان ہار مان ہی لیتا ہے۔ ہار ماننی ہی پڑتی ہے۔ اور بیٹیوں کے مقدر سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز باپ کے کندھوں کو نہیں جھکا سکتی۔

دوسری بیٹی کو بیاہنے کا حوصلہ کہاں سے لائے گا وہ...... مہوش کو......

''میرے جیسے بھائیوں کو موت آ جانی چاہیے، جو بہنوں کو ٹرک بھر کر جہیز نہیں دے سکتے۔''

''سجاد...... سجاد...... کہاں ہے......؟'' میں نے اسے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار دیکھا ہے۔ تب جب کل رات کو وہ حیدر آباد سے میرے جلنے کی خبر سن کر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور کپڑے بے ترتیب تھے۔ میں تب ہوش میں تھی اس نے آگے بڑھ کر صرف ایک نظر مجھے دیکھا تھا، میری اور اس کی نظر ملی پھر وہ کچھ کہے بغیر الٹے قدموں وارڈ سے بھاگ گیا۔ مگر بلند آواز میں رونے کی آواز اندر تک آتی رہی، وہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔

''میرے جیسے بھائیوں کو موت آ جانی چاہیے جو بہنوں کو ٹرک بھر کر جہیز نہیں دے سکتے......'' پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز غائب ہوئی۔ اور اس کے بعد وہ دوبارہ اندر نہیں آیا۔

شاید وہ میرا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا...... شاید کوئی بھی میرا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ پھر بھی سب کو میرے سامنے آنا پڑ رہا ہے۔ کیا ان میں سے کبھی کسی نے یہ سوچا ہوگا کہ زندگی میں ایک بار وہ بھی اخبار کی ایک خبر کا حصہ بن جائیں گے...... یہ تو میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ میں...... میں اخبار کی ایک خبر بن جاؤں گی۔

''کم جہیز لانے پر ایک لڑکی کو زندہ جلا دیا گیا۔''

''سسرال کے ہاتھوں بہو کا قتل......''

''جہیز نے ایک اور لڑکی کو برن یونٹ پہنچا دیا۔''

''ایک سال کے بیٹے کی ماں کھانا پکاتے ہوئے جل گئی۔'' پتہ نہیں اخبار کی سرخی کس طرح لگی ہوگی؟

ایک سال کا بیٹا......؟

''عثمان......؟''

''ہاں وہ کہاں ہے؟ عثمان کہاں ہے؟ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے میں نے اسے بھی نہیں دیکھا۔ پتا نہیں اس نے کچھ کھایا ہوگا یا نہیں؟ دو دن سے اسے بخار تھا۔ پتا نہیں آج اسے کوئی ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہوگا یا نہیں......؟ میں اس کو ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں۔ آخری بار...... دوبارہ تو کبھی......''

آنکھیں کھولنا میرے لیے مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ آکسیجن کی نالی کے ساتھ بھی سانس لینا مشکل ہو رہا ہے۔ مگر میرا ذہن، میرا ذہن ابھی...... ابھی بھی ماؤف نہیں ہوا...... چہرے، آوازیں اور چیزیں گڈمڈ ضرور ہو رہی ہیں مگر میں...... میں کچھ بھی بھولی نہیں ہوں، سوائے اس سوال کے۔ اس سوال کے بس وہ...... وہ یاد نہیں آ رہا...... ورنہ...... ورنہ باقی تو سب کچھ یاد ہے مجھے...... سب کچھ......

یہ بھی کہ چوبیس گھنٹوں سے پہلے میں نے ہونٹوں پہ کون سی لپ اسٹک لگائی تھی۔ اسکارلٹ ہاں یہی، یہی رنگ تھا۔ مجاہد کہتا تھا یہ...... یہ رنگ مجھ پر بہت اچھا لگتا ہے۔ اور چوڑیاں...... ہاں چوڑیاں بھی پہنی ہوئی تھیں میں نے...... گہری سبز رنگ کی چوڑیاں...... آگ کی لپٹوں میں آ کر شاید وہ بھی پگھل گئی ہوں گی۔ میرے وجود کی طرح۔

بچپن میں چوڑیوں کی چین بنایا کرتی تھی میں۔ موم بتی جلا کر چوڑی کے ایک سرے کو اس پر گرم کیا کرتی تھی۔ موم بتی کا شعلہ سیکنڈز میں ہی کانچ کو پگھلانے لگتا۔ پھر میں آرام سے اس پگھلے ہوئے حصے کو الگ کر دیتی اور اس جگہ سے برق رفتاری سے ایک چوڑی اس چوڑی کے اندر ڈال دیتی، پھر اتنی ہی تیزی سے پگھلے ہوئے سروں کو دوبارہ آپس میں زور سے دبا دیتی۔ کانچ ٹھنڈا ہو کر پھر آپس میں جڑ جاتا...... چین بنتی جاتی، یا پھر چوڑی کے ٹوٹے ٹکڑوں کو اسی طرح موم بتی کے شعلے پر گرم کرتی اور جب ٹکڑے کا درمیانی حصہ نرم ہو جاتا تو میں دونوں اطراف سے ٹکڑے کو پکڑ کر موڑ دیتی...... بیضوی شکل کے ان حصوں کو چین کی صورت لہراتی میں سارے گھر میں پھرتی۔

میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی خود میرے وجود سے اٹھنے والے شعلوں کی لپٹیں میرے ہاتھوں میں کھنکتی ان چوڑیوں کے کانچ کو پگھلائیں گی اور اس بار کانچ پگھلنے اور نرم ہونے کے بعد میری ہی کلائیوں کو زنجیر کی مانند اپنی گرفت میں لے لے گا۔

اسکارلٹ لپ اسٹک، سبز چوڑیاں...... اور کپڑے...... کپڑوں کا رنگ کیا تھا؟ سفید...... ہاں سفید تھا...... سلک کا سفید کڑھائی والا سوٹ۔

ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس سوٹ کی وجہ سے میرا جسم زیادہ بری طرح جلا، وہ سفید کپڑا...... سیاہ ہو کر اب بھی میرے جسم کے بہت سے حصوں پر چپکا ہوا ہے یوں جیسے وہ میری کھال کا ایک حصہ ہی بن گیا ہے۔ میرے جسم سے ان ٹکڑوں کو اتارنے کی کوشش کی جاتی، تو...... تو میرے جسم پر موجود آبلے پھوٹ پڑتے۔ کھال اتر جاتی۔ پھر شاید وہ زخم مجھے زندہ رہنے کے لیے چوبیس گھنٹے بھی نہ دیتے...... پھر شاید یہ اذیت چوبیس گھنٹے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔

مگر میں نے تو وہ لباس مجاہد کے لیے پہنا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں وہ کپڑے پہنوں...... اس نے کہا تھا وہ مجھے میری امی کے گھر لے کر جائے گا...... ہم شام تک وہیں رہیں گے۔

لیکن پھر...... لیکن پھر...... مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب اس نے میرے ساتھ کیا ہے...... اس نے...... میرے شوہر نے...... اس شخص نے جس نے قرآن کی آیات پر میرا کفیل بننے کا عہد کیا ہے۔ آپ کے سامنے اس نے میری حفاظت کا ذمہ لیا تھا...... دو سال...... پورے دو سال میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے...... دو سال میں نے اسے مقدور بھر آرام پہنچانے کی کوشش کی...... اس کو سلوٹ زدہ لباس سے بچانے کے لیے میں اپنے کئی کئی گھنٹے صرف کر دیتی۔ اور اس نے...... اس نے میرے پورے وجود کو سلوٹ زدہ کر دیا......

"مجھے یقین نہیں آتا، مجھے یقین نہیں آتا...... مجاہد میرے ساتھ یہ سب کیسے کر سکتا ہے۔ وہ تو میرا شوہر ہے...... مجھ سے محبت کرتا ہے، اس

نے مجھے کیسے جلا دیا؟ اس نے مجھے کیوں جلا دیا؟''

مگر ہو سکتا ہے اس نے مجھے نہ جلایا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے مجھے نہیں جلایا...... سب کچھ ایک حادثہ تھا...... حادثہ؟...... ہو سکتا ہے سب کچھ ایک حادثہ ہی ہو......

''مگر...... مگر وہ دروازہ...... وہ دروازہ کیوں بند تھا؟

مجاہد میری چیخوں کی آواز پر کیوں نہیں آیا؟''

کوئی مجھے بچانے کیوں نہیں آیا؟ اور وہ جھلک...... وہ جھلک...... کھڑکی...... مجاہد۔

''میرے خدا...... میرا سانس پھر اکھڑ رہا ہے۔ کیا میں مر رہی ہوں؟ کیا موت کی تکلیف ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسی میں اس وقت پچھلے چوبیس گھنٹوں سے برداشت کر رہی ہوں، اتنی لمبی موت......؟ اتنی مختصر زندگی؟ آپ نے مجھے کیا دیا؟ کیوں دیا؟

اٹھارہ سال میں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ گزارے...... میں خوش تھی، پھر دو سال میں نے...... میں نے کہاں گزارے، ہاں شادی ہو گئی تھی میری...... ایف اے کے بعد...... مجاہد سے...... میں مٹھیوں میں خواب لے کر اس کے گھر آئی تھی۔ ہر لڑکی یہی کرتی ہے...... میں بھی خواب لے کر ایک سراب میں داخل ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا مجھے چاہا جائے گا۔ سب لوگ یہی کہتے تھے مجھ میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ خوبصورتی، اخلاق، ایثار، خوش مزاجی، نرم خوئی، برداشت، تحمل، سمجھداری، سلیقہ......

گنتی ان سے شروع نہیں ہوئی تھی۔ گنتی کہیں اور سے شروع ہوئی تھی، ٹی وی، وی سی آر، فریج، زیور، موٹر سائیکل، میں شاکڈ رہ گئی، خوف نے مجھے اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا، میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ جو تھا وہ بے مول تھا...... ساس، سسر، نندیں، شوہر، ہر ایک کی زبان پر ایک جیسے لفظ تھے...... وہ تلخ تھے، زہریلے تھے۔ کانٹے تھے۔

''وقت گزرنے کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا......'' میں ہر بار خود کو یہی کہہ کر تسلی دیتی۔

''سسرال والے ایسی باتیں کرتے ہی ہیں۔'' میں سوچتی ''میں اپنی خدمت سے ان کے دل جیت لوں گی۔''

''ہاں خدمت سے، دلوں کو جیتا جا سکتا ہے۔ مگر جن لوگوں کے وجود کے اندر دلوں کے بجائے ہوس اور لالچ کے بت پیوست ہوں ان کو...... ان کو......''

دو سال میں نے سب کچھ برداشت کیا...... سب کچھ بد سے بدتر ہوتا گیا۔ عثمان کی پیدائش نے بھی کچھ تبدیل نہیں کیا۔ لیکن میں پھر بھی مطمئن تھی...... میرا گھر قائم تھا، شادی ختم نہیں ہوئی تھی۔

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا...... سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا......'' میری زبان پر ایک ہی ورد رہتا تھا۔ مجاہد کے مارنے پر بھی، ساس کے گالیاں دینے پر بھی، نندوں کے بے عزتی کرنے پر بھی......

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا......'' میں خوش تھی، میرا گھر قائم تھا۔ میں ماں باپ پر بوجھ نہیں بن سکتی تھی۔ وہ

مجھے سہارا نہیں دے سکتے تھے......نہ معاشی طور پر نہ معاشرتی طور پر......اس گھر سے نکل جانے کی صورت میں معاشرہ مجھے کھا جاتا، میں وہاں سے نہیں نکلی اور آج میں یہاں ہوں۔

''پھر......پھر......سب کچھ ٹھیک ہونا شروع ہو گیا، میری دعائیں رنگ لانے لگیں۔ مجاہد نے مجھ سے اپنے رویے کی معافی مانگی......میں نے اسے معاف کر دیا۔ میری ساس، سسر، نندیں سب کا سلوک میرے ساتھ بدل گیا......میں خوش تھی۔ میں نے اپنے ماں باپ کو بھی بتا دیا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے سب کچھ......وہ خوش تھے۔ پُرسکون تھے۔ میری وجہ سے ہونے والی اذیت ختم ہو گئی تھی۔

وہ چند ہفتے میری زندگی کے سب سے بہترین دن تھے۔ دو سال لگے مجھے سب کچھ ٹھیک کرتے۔ مگر سب کچھ ٹھیک ہو ہی گیا۔ آپ کو کیوں بتا رہی ہوں میں؟ آپ تو سب کچھ جانتے ہی ہیں......میری خوشی اور اطمینان کا اندازہ آپ سے بڑھ کر کس کو ہو سکتا ہے۔

کل بھی تو یہی ہوا تھا، مجاہد نے کہا تھا وہ مجھے میرے گھر لے کر جائے گا۔ ہم شام وہیں گزاریں گے۔ میرے لیے لباس کا انتخاب بھی اسی نے کیا۔ سلک کا سفید لباس، وہ اتوار کا دن تھا اتوار کو مجاہد گھر ہی پر ہوتا تھا۔ اتوار کو سب لوگ ہی گھر پر ہوتے تھے۔ مگر اس دن میرے سسر دو پہر سے کچھ دیر پہلے کہیں چلے گئے۔ میری دونوں نندیں بھی کہیں چلی گئیں، گھر میں صرف مجاہد اور میری ساس تھیں۔ میں صبح ناشتے کے بعد سے کچن میں نہیں جا سکی تھی۔ عثمان کے لیے فیڈر بھی مجاہد ہی تیار کر کے لایا۔ مجھے حیرانی ہوئی مگر اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔

دو پہر کے قریب اس نے مجھے تیار ہونے کے لیے کہا، میں دو پہر کا کھانا پکا کر تیار ہونا چاہتی تھی مگر اس نے روک دیا۔

''گھر میں امی کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں ہے تو کھانا کون کھائے گا؟ ہم تو ویسے بھی جا رہے ہیں۔ امی کہہ رہی تھیں کہ وہ دو پہر کا کھانا نہیں کھائیں گی تم بس جلدی سے تیار ہو جاؤ تا کہ ہم لوگ جا سکیں۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

میں اس کی بات مانتے ہوئے تیار ہونے لگی۔ اس نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اپنے لمبے بال کھلے چھوڑ دوں۔ میں گرمی میں سلک کا سوٹ پہننا نہیں چاہتی تھی، مگر وہ بضد تھا کہ میں وہی کپڑے پہنوں میں تیار ہو گئی تھی جب اس نے مجھ سے چائے کی فرمائش کی۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی، اسی وقت میں نے اپنے کمرے میں پڑے ہوئے ڈیک کو بلند آواز میں بجتے سنا۔ مجھے حیرت ہوئی مجاہد کبھی اتنی بلند آواز میں ڈیک نہیں سنتا تھا مگر اس وقت......

کچن کے دروازے سے بہت دور ہی میں نے سوئی گیس کی تیز بو محسوس کر لی۔ یقیناً کچن میں کہیں سے گیس لیک ہو رہی تھی یا پھر چولہے کا والو کھلا رہ گیا ہو گا۔ میں کچھ فکرمندی سے اندر آئی، کچن میں گیس کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی، میں سانس روکتے ہوئے چولہے کے پاس آ گئی۔ دونوں برنرز کے والو پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں انہیں بند کرتی۔ میں نے اپنی پشت پر کچن کے دروازے کو ایک جھٹکے سے بند ہوتے سنا۔ میں بے اختیار پلٹی، میں دروازے کی طرف جانا چاہتی تھی مگر میں قدم اٹھا نہیں سکی۔ کچن کی کھلی کھڑکی سے ایک جلتی ہوئی دیا سلائی کو میں نے اڑ کر اندر آتے دیکھا۔ پھر ایک......ایک دھماکہ ہوا تھا۔ مجھے سب کچھ سمجھنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ میں آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں چیخ رہی تھی۔ میں نے دروازے کی طرف بھاگ کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ بند تھا، وہ نہیں کھلا، میں نے اس کو پوری قوت سے بجایا، وہ نہیں کھلا میں چیختی ہوئی کچن

میں موجود پانی کے نل کی طرف بھاگی، اس میں پانی نہیں آ رہا تھا۔ ٹھنڈے اور گرم دونوں والوز کو گھمانے سے پانی نہیں آیا۔ آگ کے شعلے بڑھتے جا رہے تھے۔

باہر ڈیک بلند آواز سے بج رہا تھا، اندر میں چیخ رہی تھی۔ پھر میں کھڑکی کی طرف گئی اور تب......تب......آگ کی اٹھتی ہوئی لپٹوں سے میں نے کھڑکی کے باہر صحن میں مجاہد اور اپنی ساس کو دیکھا......ایک لمحے کے لیے......ایک لحظے کے لیے......بلند آواز میں چیختے ہوئے میں نے انھیں پکارا......وہ برق رفتاری سے اندر کمرے میں چلے گئے۔

میرا ذہن ماؤف ہو گیا......وہ میری طرف کیوں نہیں آئے؟ کیا انھوں نے خود مجھے؟ سب کچھ ختم ہونے لگا......کیا انھوں نے خود میرے ساتھ یہ سب کچھ کیا......؟ مجھے تب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر دھواں جا رہا تھا۔ میں اب اپنے گوشت کے جلنے کی بو کو محسوس کر سکتی تھی۔ میری چیخیں آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھیں۔ میں اس کھڑکی کے سامنے گر رہی تھی۔ ڈیک اب بھی بج رہا تھا۔ سامنے میرے کمرے کا دروازہ بند تھا......اندر میرا بیٹا تھا۔ میرا شوہر تھا، میری ساس تھی، کچن میں میرے چاروں جانب آگ تھی......مجھے اس وقت صرف آپ یاد آئے تھے، صرف آپ یاد آ رہے تھے......کیوں یاد آ رہے تھے آپ......؟

زمین پر گرتے ہوئے میرے کانوں نے بیرونی دروازے کو دھڑ دھڑاتے اور بہت سے لوگوں کو بولتے سنا......اس کے بعد پھر مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا......شاید کسی نے کچن کا دروازہ کھولا تھا......شاید کسی نے مجھ پر پانی پھینکا تھا۔ شاید کسی نے میرے گرد کوئی کمبل لپیٹا تھا......اس کے بعد میرے لیے ہر چیز شاید بن کر رہ گئی تھی۔

دوبارہ آنکھیں میں نے ہاسپٹل کے اسی بستر پر کھولی تھیں۔ میرے دائیں طرف ایک کرسی پر وہی تھا......مجاہد میرا شوہر......

''یہ سب ایک حادثہ تھا، تمھیں احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ میں نے ہمیشہ تم سے کہا تھا کہ احتیاط کیا کرو......'' میری کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے وہ کہہ رہا تھا۔ اور میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

دو سال کسی جانور کو پاس رکھنے پر بھی اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ اسے ٹھوکر مارنے کے لیے بھی قدم اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیا اس شخص کو دو سال میں مجھ سے اتنی سی محبت بھی نہیں ہوئی تھی؟ مجھے آگ میں جھونکتے ہوئے اس نے مجھے انسان کے بجائے ایندھن کیوں سمجھا......؟ دو سال میں اس شخص کو پہنچنے والی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف پر میں تڑپ اٹھتی تھی......معمولی سی کھانسی ہوتی یا انگلی پر لگنے والی خراش......وہ جب تک ٹھیک نہ ہو جاتا مجھے چین نہ آتا......اور......اور......اس شخص نے مجھے اپنے ہاتھوں سے جلا دیا......

میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی اور وہ مجھ سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر اطمینان تھا......ٹی وی، فریج، وی سی آر، زیور، موٹر سائیکل، کیا اس نے مجھے صرف ان چیزوں کی وجہ سے جلا دیا تھا۔ کیا صرف یہ چیزیں نہ لانے کی وجہ سے اس کے دل میں میرے لیے اتنی نفرت بیٹھ گئی تھی۔ کہ میری دو سال کی خدمت اور اولاد بھی اس نفرت کو کم نہیں کر سکی۔

''ابھی پولیس آئے گی......تم انھیں بتا دینا کہ یہ حادثہ تھا......'' وہ اب مجھ سے کہہ رہا تھا۔

''حادثہ نہیں تھا......تم لوگوں نے مجھے جلایا......''میں نے کراہتے ہوئے اس سے کہا۔

وہ کچھ لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گیا اور میرے چہرے پر نظریں گاڑے رہا۔

''تم پولیس کو یہ کہو گی؟''اس بار اس کی آواز میں اشتعال تھا۔

''ہاں......''

''پھر کیا ہوگا؟ تم نے سوچا ہے......تم مر جاؤ گی۔ میں جیل چلا جاؤں گا......عثمان کا کیا ہوگا......؟ وہ کہاں جائے گا؟ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ مجھے معاف کر دو تم پولیس سے یہی کہنا کہ یہ ایک حادثہ تھا، اپنے بیٹے کے لیے......تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''وہ اب مدھم آواز میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔

''ہاں! میں نے عثمان کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا......اس کا کیا ہوگا......پولیس اس شخص کو پکڑ لے گی تو کیا ہوگا......؟ مقدمے کی پیروی کون کرے گا؟ یہ رہا ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اسے سزا ہو گئی تو عثمان کا کیا ہوگا......؟''میں خاموش ہو گئی۔

میرے پاس لفظ ختم ہو گئے۔ صرف زندگی باقی رہ گئی۔ عورت کے پاس صرف زندگی ہوتی ہے اور کچھ نہیں ہوتا......

میں نے اپنی ساس کو دیکھا، ان کے ساتھ محلے کی کچھ اور عورتیں تھیں، وہ رو رہی تھیں غش کھا رہی تھیں۔

''کاش میں سوئی نہ ہوتی......کیوں نیند آ گئی مجھے......مجھے کیا پتا تھا میری بہو کے ساتھ یہ ہو جائے گا......اس کے بجائے میرے ساتھ یہ ہو جاتا......''وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

میں انہیں دیکھ رہی تھی، میں نے اپنی ماں میں رحم کے علاوہ اور کوئی صفت نہیں دیکھی تھی۔ ماؤں میں رحم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا یہ میری خوش فہمی تھی۔ دو سال میں نے اس عورت میں بھی یہی صفت تلاش کرنے کی کوشش کی تھی کبھی نہ کبھی تو اس کی زبان کے کانٹے ختم ہوں گے۔ کبھی تو اس کے لفظوں کا زہر کم ہوگا......کبھی تو......لیکن سب کچھ بڑھتا گیا۔ انہیں مجھ پر رحم نہیں آیا۔ ٹی وی، فریج، وی سی آر اور موٹر سائیکل نہ لانے والی بہو پر رحم کیسے کیا جا سکتا ہے......؟ کیا انہیں احساس ہے کہ جلتے ہوئے جسم کی تکلیف کیسی ہوتی ہے......؟ جب پورا جسم موم بتی کی طرح پگھل رہا ہو۔ جلد، کھال، چربی، گوشت، سب کچھ جل رہا ہو اور انسان چاہنے کے باوجود شعلوں کو بجھا نہ سکتا ہو......تو......تو......؟

میں اب اپنی نندوں کو دیکھ رہی تھی جو میری ساس کی طرح رو رہی تھیں۔ مجھے جلاتے ہوئے کیا انھوں نے یہ کبھی سوچا کہ اگر انہیں خود کبھی میری طرح جلنا پڑا......ان کو......یا کبھی آج سے کئی سال بعد ان کی بیٹیوں میں سے کسی کو......

دو سال میں نے کئی بار انہیں ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی تحریروں کے کرداروں کے لیے آنسو بہاتے دیکھا ہے......کیا صرف رحم اور ہمدردی ان کے لیے ہونی چاہیے؟ جو زندہ نہ ہوں فرضی کردار ہوں......میرے جیسے حقیقی کرداروں کے لیے ان کے پاس......کیا میرے کم جہیز لانے کے ''گناہ'' کو وہ معاف نہیں کر سکتی تھیں؟ کیا کبھی ایک بار وہ میری ساس سے یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ میرے ساتھ سب کچھ نہ کریں......مجھے تکلیف نہ دیں، کیا وہ مجاہد سے یہ سب نہیں کہہ سکتی تھیں......کیا وہ......''

پھر کچھ دیر بعد میرے گھر والے آ گئے...... پھر پولیس آ گئی، مجاہد اور اس کے گھر والے غائب ہو گئے تھے...... میں نے اس کے بعد انھیں نہیں دیکھا۔ میرے گھر والے انھیں الزام دے رہے تھے، محلے کے بہت سے لوگ بھی یہی کہہ رہے تھے...... پولیس کے ایک انسپکٹر نے مجھ سے بیان لینے کی کوشش کی۔

''کیا یہ حادثہ تھا؟ کیا مجھے میرے سسرال والوں نے جلایا؟ سب کچھ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا...... ؟ کچن کا دروازہ باہر سے کس نے بند کیا؟ کیا میں نے خودکشی کی کوشش کی ہے؟ کیا مجھے کسی پر شک ہے؟ میرے سسرال والوں کا رویہ میرے ساتھ کیسا تھا؟ میرے شوہر کا سلوک کیسا تھا؟''

وہ مجھ سے ایک کے بعد ایک سوال پوچھتا رہا، خاموشی اور کراہوں کے علاوہ میرے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''سچ بتا دیں بی بی ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

بستر مرگ پر پڑی اب میں کس سے ڈر سکتی ہوں...... ؟ مگر سچ...... سچ بتانے کی ہمت میرے اندر نہیں ہے۔ وہ معاشرے نے چھین لی ہے۔

وہ بہت دیر مجھے بولنے پر مجبور کرتا رہا پھر میری سانس اکھڑنے لگی تو ڈاکٹر نے اسے باہر بھیج دیا۔

''تم اسے بتا دو کہ یہ سب کچھ...... یہ سب کچھ......'' اس کے جانے کے بعد میری امی نے کہا اور پھر بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگیں۔

میں ایک بار پھر غشی میں چلی گئی۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ اور اب...... اب جب ڈاکٹر میرے گھر والوں کو بتا چکے ہیں کہ میں کسی بھی لمحے مر جاؤں گی...... تو...... تو...... وہ سوال مجھے مرنے نہیں دے رہا...... وہی سوال جو...... جو مجھے یاد نہیں آ رہا......

''اوہ میرے اللہ......''

میری تکلیف...... میری تکلیف......

میرا ذہن......

آنکھیں...... آنکھیں نہیں کھل رہی۔

سانس...... سانس......

میرا جسم بے جان......

سب کچھ ختم......

میرا بیٹا......

کیا...... کیا یہ موت......

وہ سوال......

ہاں...... ہاں یاد...... یاد...... آ...... رہا ہے۔

میں......میں آپ سے......پوچھنا......پوچھنا چاہتی ہوں......

آپ نے کہا تھا......آگ کا عذاب صرف......

صرف اللہ......اللہ دے سکتا ہے......آپ دے سکتے ہیں......

اور کوئی نہیں......انسان نہیں......مگر مجھے......مجھے تو انسانوں......انسانوں نے آگ کا عذاب دے دیا ہے......

میں نے......میں......اسی دنیا میں دوزخ کے عذاب سے گزر رہی ہوں......بس فرق یہ ہے کہ یہ دوزخ انسان نے دہکایا ہے......

میں پوچھنا چاہتی ہوں اب......اب......جب میں مرجاؤں گی......تو......تو کیا آپ......آپ مجھے دوبارہ دوزخ......میں پھینکیں گے؟

دوسرے دوزخ میں......کیا آپ میرے لیے......دوبارہ دوزخ دہکائیں گے؟ دوبارہ مجھے اس میں پھینکیں گے؟

میں آپ کو بتانا......بتانا چاہتی ہوں......مجھے......انسانوں کے دوزخ......سے گزرنے......گزرنے کے بعد آپ کے دوزخ سے خوف نہیں آرہا......دوسرے دوزخ سے......اللہ کیا......کیا آپ......مجھے......

دوسرا......دوسرا دوزخ دیں گے؟ میں......آپ......سانس......میں......اندھیرا......گھٹن......

☆......✪......☆

ختم شد

☆......✪......☆